ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی تصورات

Critical Views of Dr.Wazir Agha

Muhammad Aamir Sohail
Research Scholar, Punjab University,Lahore

ABSTRACT

Dr. Wazir Agha is one of leading critics of Urdu literature. He has provided excellent example of practical criticism from classical literature to modern literature. His great work is 'IMTZAJI TANQEED' and 'TAKHLIQI AMAL'. This article focuses on his ideological critique, Especially text, creation, reader and process of reading. According to Wazir Agha, the reader reads the text and the text reads the reader. The reader is equally involved in the creative process. Text makes sense when read. The status of the reader, process of reading and what is text authority, these topic are included in this article. This article introduces new dimensions to Wazir Agha's ideas.

Keywords: وزیر آغا، متن، قاری، قرات کا عمل، قاری کی اقسام

ادبی متون کی تشریح و تفہیم اور تنقید و تجزیہ کے تین معروف زاویے رہے ہیں۔مثلث کے یہ تین کنارے مصنف، متن اور قاری ہیں۔مصنف اساس تنقیدی نظریات میں تاریخی تنقید، سوانحی تنقید، نفسیاتی تنقید، سیاسی، سماجی اور تہذیبی مطالعات شامل ہیں۔ متن اساس تنقیدی تصورات میں نئی تنقید، امریکی تنقید، شکاگو اسکول، ہئیتی تنقید، روسی ہئیت پسندی، ساختیات، پس ساختیات، رد تشکیل اور بین المتونیت شامل ہیں۔ قاری اساس تنقیدی تھیوری میں مظہریاتی تنقید، شرحیات، تعبیریات اور ان سب کے متوازی قاری اور متن کا تعلق اور اس تعلق کے نتیجے میں قاری کو حاصل ہونے والے قراتی تجربے کا بیان ہے۔قرات کے عمل سے قاری محض معنی حاصل نہیں کرتا بلکہ فنی و جمالیاتی عناصر سے حظ بھی اٹھاتا ہے۔ متن کی کمزوری الگ مسئلہ ہے۔ یہاں یہ بات زور دے کر کہنے کی ہے کہ مصنف اساس تنقید ہو یا متن اساس، اسے انجام دینے والا قاری/نقاد ہی ہوتا ہے۔ مسئلہ تب پیش آتا ہے جب مصنف اساس اور متن اساس تنقیدی نظریات کی نظریاتی حدود میں رہ کر قاری/نقاد کو تنقیدی عمل تکمیل تک پہنچانا پڑتا ہے۔اس میں قاری کی حیثیت میکانکی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قاری کا ذاتی قرات کا تجربہ اہم نہیں رہتا بلکہ مصنف کی منشا، اس کی نفسیاتی کیفیات، اس کے عہد کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور تاریخی صورت حال اور مصنف پر سیاسی و سماجی قوتوں کے اثرات کا تجزیہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔اسی طرح متن

اساس تنقیدی نظریات اور اصولوں کے نظریاتی مباحث کی روشنی میں متن فہمی کی پابندی لازم ٹھہرتی ہے۔ قاری کا قراتی تجربہ حاشیے پہ رہ جاتا ہے۔ مصنف اور متن اساس تنقیدی نظریات کے جبر کو توڑنے کے لیے' قاری اساس تنقید' نے جنم لیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے نظری و عملی تنقید میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔انھوں نے شاعری، فکشن اور غیر افسانوی اصناف پہ گراں قدر مقالات پیش کیے ہیں۔ جدید اور مابعد جدید تنقید پر ان کے مقالات نے آئندہ اردو تنقید کی راہ ہموار کی ہے۔ وہ اردو کے نظریہ ساز نقاد ہیں۔امتزاجی تنقید کی شعریات مرتب کرنے سے تخلیقی عمل کی دریافت اور بازیافت تک انھوں نے تنقید میں حصہ ڈالا ہے۔اس مقالے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ان تصورات کا جائزہ لیا جائے گا جو متن، قاری اور قرات کے عمل کے متعلق ہیں۔ان مباحث کا تعلق براہ راست' قاری اساس تنقید' سے ہے۔مابعد جدید تنقید میں' قاری اساس تنقید' کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس تنقیدی مکتب فکر نے قرات کے عمل کو اہمیت دی ہے۔اس سے قبل معنی آفرینی کے لیے مصنف اور متن کو سامنے رکھا جاتا رہا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قاری/نقاد پر منحصر تھے۔ قاری اساس تنقید نے متن فہمی کی ساری اہمیت قاری کو دے کر مصنف اور متن اساس نظریات کی مرکزی حیثیت کو چیلنج کیا ہے۔اس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ قاری ہی ہے جو متن کو با معنی بناتا ہے اگر قاری نہ ہو یا قرات کے عمل سے متن نہ گزرے تو وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ متن کے وجود کے بغیر قاری کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر متن اور قاری لازم ملزوم ہو جاتے ہیں۔

قاری اس وقت قاری کہلاتا ہے جب وہ قرات کے عمل سے گزرتا ہے۔ قاری کی اقسام، قرات کے طریقے، قرینے اور سلیقے، نظریاتی جبر اور اس کے زیر نظر انداز ہونے والے معنی، متن سے معنی اخذ کرنے کی صلاحیت، تنقیدی شعور اور اس شعور سے حاصل ہونے والے معنی، نیز متن کی صنف، ہئیت، تکنیک اور تجربات یکساں نہیں بلکہ ان سب کی متعدد اور متنوع زاویے اور جہات ہیں۔ قاری اساس تنقید میں سب سے اہم بحث 'قاری اور متن کے رشتے' کی ہے۔ وزیر آغا نے اپنی کتاب' تنقید اور جدید اردو تنقید' میں ہمارے مذکورہ مطالعے کے مطابق جن مباحث کا ذکر کیا ہے ان میں قاری اور تخلیق کا رشتہ، ساختیات اور قاری کی اہمیت، قاری اساس تنقید میں قاری کی مرکزیت، قاری کی اقسام، قاری اور تعین قدر، قاری کی تخلیقی عمل میں شرکت، قاری کی معنی تک نارسائی شامل ہیں۔ قاری اساس تنقید کے نظریہ ساز فش اور آئزر کے قول بھی نقل کیے ہیں۔ یہ کتاب 1989ء میں شائع ہوئی ہے۔ گوپی چند نارنگ کی کتاب' قاری اساس تنقید' 1992ء میں منظر عام پر آئی ہے۔اردو تنقید میں قاری اساس تنقید کا عموماً آغاز موخرالذکر کتاب سے سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سے قبل قاری اساس تنقید کے بنیادی مباحث کا ذکر اپنی کتاب' تنقید اور جدید اردو تنقید' میں کیا ہے۔ اب تک اردو تنقید میں قاری اساس تنقید کے مباحث نارنگ سے استفادہ کر کے آگے بڑھائے گئے ہیں، اور ڈاکٹر وزیر آغا کے تصورات کی جانب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ مقالہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔

تخلیق کا مصنف اور قاری دونوں سے رشتہ جڑا ہوتا ہے۔ ادبی تنقید میں تخلیق کے قاری سے رشتے پر غور کیا جاتا ہے۔ مصنف اور تخلیق کا رشتہ داخلی تنقیدIntrinsic criticism کہلاتا ہے۔ جبکہ ادبی تنقید کا تعلق Extrinsic criticism سے ہے۔اس میں قاری اور تخلیق کے تعلق، رشتے اور روبرو ہونے کے مباحث شامل ہیں۔ قاری اور تخلیق کا رشتہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب قاری متن کے سامنے اور روبرو ہوتا ہے۔ قرات کے اس عمل میں قاری/نقاد کی ترجیحات، تعصبات، مطالعہ، تجربہ اور علم متوازی رہتا ہے۔ دوران قرات اس کے ذہن میں متوازی رویئیں چل رہی ہوتی

ہیں۔ متن اس کے ذہن میں تحرک پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اور قاری متن پر اثر ڈال رہا ہوتا ہے۔ سرسری مطالعہ سے تخلیق قاری کے سامنے اپنے در وا کرتی ہے اور نہ ہی بقول وزیر آغا قاری تخلیق کو تخلیق مکرر کر سکتا ہے۔ قاری اور تخلیق کے رشتے کے بارے میں وزیر آغا نے جن نکات کو بیان کیا ہے انھیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

1۔ تخلیق بھی اپنے بند قبا کو ڈھیلا دے گی جب کھلے دل و دماغ کے ساتھ تخلیق کی طرف پیش قدمی کرے گا۔[۱]

2۔ قاری تخلیق کے روبرو آ کر اپنے بند قبا کھولنے پر مائل ہو جاتا ہے۔[۲]

3۔ اعلیٰ فن کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ قاری کو (چاہے وہ زمانہ ہو یا فرد) اپنے سے متعارف ہونے کا موقع عطا کرتا ہے۔[۳]

4۔ تخلیق اپنی جگہ ایک بند اور سرد مہر کائنات ہے جب تک قاری اس کے روبرو نہیں آئے گا یہ بند کائنات متحرک ہونے یا منعکس ہونے کی صلاحیت سے محروم رہے گی۔[۴]

5۔ جب قاری اور متن روبرو ہوتے ہیں تو عکس در عکس کا سلسلہ جنم لیتا ہے، یہ دوہرا عمل ہے جس میں دونوں فریق نہ صرف ایک دوسرے کو دریافت کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو از سر نو تخلیق بھی کرتے ہیں، یوں وہ دونوں قرات سے قبل اور قرات کے بعد میں بدلی صورت میں سامنے آتے ہیں۔[۵]

6۔ قاری اور تخلیق جب تک دونوں اپنے اوپر سے زنگ اتار کر ایک دوسرے کے روبرو نہ آئیں وہ ایک دوسرے کو منعکس نہیں کر سکتے اور جب تک منعکس نہ کریں معنی آفرینی کے عمل میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔[۶]

7۔ قاری یا ناقد قرات کے ذریعے تخلیق کے اسرار سے روشناس ہو کر معانی کی تخلیق کرتا ہے۔[۷]

8۔ تخلیق کی طرح قاری بھی زرہ بکتر پہنے ہوتا ہے۔ تخلیق لفظیات کا زرہ بکتر اور قاری تعصبات کا! مگر جب وہ ایک دوسرے کے روبرو آتے ہیں تو باہمی حرارت سے دونوں کے زرہ بکتر پگھل جاتے ہیں۔[۸]

9۔ تخلیق کی قرات کا عمل بھی اصلاً تخلیق کاری کا ہی عمل ہے۔[۹]

ان نکات سے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کہ تخلیق اور قاری دونوں کچھ عیاں اور کچھ پنہاں ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے آ کر ہی معنی آفرینی کا عمل ہوتا ہے۔ معنی آفرینی کا عمل دوسرے لفظوں میں تخلیق مکرر کا عمل ہی ہے۔ اول تخلیقی متن میں رخنے، خالی جگہیں اور خلا ہوتے ہیں دوم وہ بین المتونی ہوتا ہے۔ تخلیق کے ان دونوں مضمرات سے آگاہی حاصل کیے بغیر اس کی تفہیم نامکمل رہتی ہے۔ وزیر آغا نے مذکورہ جن نکات میں تخلیق اور قاری کے رشتے کا ذکر کیا ہے ان میں قرات کے مسائل کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ ہر قاری/نقاد تخلیق کے بند قبا کو کھولنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اور نہ ہی ایسی قرات ہر قاری کے بس میں ہے کہ اس کی قرات تخلیق مکرر تک جا پہنچے۔ شمیم حنفی کی رائے یہاں بر محل ہے:

> "پھر یہ بھی ہے کہ ہر طبعی عمل کی طرح ہر تخلیقی تجربے کی بھی ایک مابعد الطبیعیات ہوتی ہے لہذا تفہیم و تعبیر کی کوئی بھی سرگرمی تخلیقی متن کے تمام اوضاع اور عناصر کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ تنقید کا کوئی بھی تصور، اس میں چاہے جتنی گنجائش پیدا کر لی جائے کبھی خود مکتفی نہیں ہو سکتا۔"[۱۰]

سوال یہ ہے کہ کیا قاری کے روبرو ہوتے ہی تخلیق اپنے اندر موجود خلا واضح کر دیتی ہے اور اپنا بند قبا قاری پہ کھول دیتی ہے؟ چاہے قاری جس قدر تخلیقی جست سے کام لے۔ ہماری رائے میں کوئی قرات آخری قرات نہیں اور نہ ہی قرات اپنی معنی پر اصرار کرنے کی جرات کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ ہر قرات ناقص یا نامکمل ہوتی ہے، اس کا یہ نقص یا خامی نہیں بلکہ متن کا تخلیقی وصف رکھنے کی دلیل ہے اور دوسری جانب نئے معانی دریافت کرنے کی گنجائش رکھنا ہے۔

وزیر آغا کے مطابق غزل کے ہر شعر کے دونوں مصرعے دو قدموں کی طرح ہوتے ہیں۔ جس میں ایک قدم دوسرے سے نسبتاً اونچا ہوتا ہے۔ ان دونوں قدموں میں موجود رکاوٹ، غزل کا قاری اپنے تخلیقی عمل سے عبور کرتا ہے۔ قاری کے اس عمل کو وزیر آغا نے تخلیقی جست کا نام دیا ہے۔ سوال ہے کہ کیا ہر قاری تخلیقی جست کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگر رکھتا ہے تو غزل کے شعر کی ایک قرات ہی اس میں موجود ہر معنی کے دریافت کرنے پر قادر کیوں نہیں ہے۔ اس تخلیقی جست کا یہ مطلب بالکل نہیں ہیں کہ آئندہ کے لیے اخذ معنی کے امکانات محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ تخلیق اور قاری کا ایک دوسرے کے روبرو ہو کر بالترتیب لفظیات اور تعصبات سے باہر آ جانا، محض خوش گمانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی متن خلا، درزیں، خالی جگہیں اور دراڑیں رکھتا ہے اور ساتھ اس کی حیثیت بین المتونی بھی ہوتی ہے۔ یہ دونوں اس کے وصف ہیں۔ اول الذکر سے ابہام پیدا ہوتا ہے جبکہ موخر الذکر سے قاری متن کو اس لیے نہیں سمجھ پاتا کہ وہ دیگر متون سے جڑا ہوتا ہے۔ کم مطالعہ قاری کے بہت مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اخذ معنی کی صلاحیت ہر قاری میں الگ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں قاری اساس تنقید کے مطابق:

> "قاری کو معنی اخذ کرنے کی پوری آزادی ہے، ہر قاری ایک منفرد مزاج، تجربہ، تعصبات، سوچ اور فکر اور نقطہ نظر اور اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے کسی متن سے اخذ معنی کے لیے کس طرح کی قرات کی جائے۔ اس کا فیصلہ ہر قاری اپنی اوقات کے مطابق خود کرتا ہے۔"[۱۱]

وزیر آغا نے تخلیق میں موجود لفظیات اور قاری کے تعصبات کی طرف توجہ دی ہے، لیکن تخلیق کے بین المتونی وصف (کیوں کہ یہ بھی متن فہمی میں رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے) اور قاری کی کم علمی اور اس کی کمزوریوں کے دیگر پہلوؤں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ایک جگہ وہ قاری کی نارسائی کا ذکر ضرور کرتے ہیں اسے آئندہ صفحات میں بتایا جائے گا۔ جہاں بتانا یہ مقصور ہے کہ قرات کے عمل میں تخلیق مکرر تک پہنچنے کی صلاحیت ہر قاری میں نہیں ہے۔ بر سبیل تذکرہ وہ ناقدین جو کسی تنقیدی تصور یا تنقیدی تھیوری پر محض اس لیے شک کی نگاہ ڈالتے ہیں کہ وہ فن پاروں کو ان کی کلیت اور ایک وحدت میں دیکھنے سے معذور ہے۔ کسی تنقیدی تصور یا تنقیدی تھیوری پر یہ اصرار کرنا کہ اس نے فن پارے کو کلیت میں دیکھا ہے، تو یہ اس نقاد کا مغالطہ ہے۔ اگر کوئی نقاد دعوی کرے کہ اس نے فن پارے کو اس کی جملہ ممکنہ جہات اور زاویوں میں دیکھ، پرکھ اور سمجھ لیا ہے تو وہ بھی سخت خوش گمانی کا شکار ہے۔ پس تھیوری یا تنقیدی تصور پر اعتراض بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی متون آئندہ اپنی تفہیم و تعبیر کے امکانات کھلے رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو معنی قاری اخذ کرتا ہے یا سمجھتا ہے ان کا تعلق متن سے کم اور قاری کی ذہنی اختراح پر زیادہ ہو۔

قاری اساس تنقید کی اساس میں ساختیات اور مابعد ساختیات کے ان رویوں کی طرف اشارہ لازمی ہے، جن کے مطابق قاری/ناقد قرات کرتے ہوئے اس میں شامل ہوتا ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

"معنی تخلیق میں مضمر نہیں ہوتا بلکہ قاری کے ہاں قرات کے تجربے سے پھوٹتا ہے۔ اسٹرکچرل تنقیدی لسانیات اور لسان فہمی سے بطور خاص مدد لے کر اپنا رخ تخلیق کے بجائے تخلیق کی قرات کی طرف کر کے تخلیق کار کے مقابلے میں قاری کو تمام تر اہمیت بخش دی۔ بعد ازاں Deconstruction کا جو نظریہ مقبول ہوا وہ بھی اصلاً اسٹرکچرل تنقید سے منسلک تھا اور تخلیق کی قرات کو تمام تر اہمیت کے حق میں تھا۔"[۱۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساختیات اور ساخت شکن تنقیدی تصورات نے متن کے بجائے قاری کو اہمیت دی۔ قرات کے دوران قاری/نقاد معنی کی تخلیق کرتا ہے، اور یہ معنی متن کے چاک Gap میں سے نظر آتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ وزیر آغا اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ ساختیات نے تخلیق کے بجائے قاری کو جو اہمیت دی یہ قابل اعتراض ہے۔ وزیر آغا کی چار کتابوں سے قاری اور قرات کے عمل کے مباحث کو یہاں کتب کی زمانی ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے، جس سے ان کے نظریات میں آنے والے ارتقا سے بھی آگاہی ہو گی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تخلیقی عمل" 1970ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے لکھا، 'تخلیق کار وہ شخص ہے جو اپنی ذات میں غوطہ لگا کر ایک نایاب جوہر خلق کرتا ہے اور پھر اسے اپنی تربیت کے مطابق تراشتا اور سنوارتا ہے جب کہ 'باہر کا قاری' وہ جوہری ہے جو اس کے اصلی یا نقلی ہونے کے بارے میں فیصلہ دیتا ہے اور اس کے لیے تخلیقِ مکرر کے سارے عمل سے گزرنا ہو گا۔'[۱۳] اپنے اس بیان وہ خود نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہاں قاری کو ثانوی حیثیت پہ رکھا ہے۔ (جبکہ ہماری نظر میں وہ قاری کو مصنف کے برابر قرار دے رہے ہیں)۔ ان کی کتاب "تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں" 1977ء میں فاضل نقاد کو محسوس ہوا کہ قاری کا منصب محض ناظر یا منصف کا نہیں ہے جو تخلیق کو دیکھ لیتا ہے یا اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ سناتا ہے بلکہ وہ خود بھی تخلیق کاری کے عمل میں شریک ہوتا ہے۔[۱۴] (قاری کا تخلیقی عمل میں شریک ہونا دراصل تخلیق کار کے برابر ہونا ہے)۔ ان دونوں کتابوں میں فاضل نقاد نے قاری کو تخلیقی عمل میں شرکت تک رکھا ہے۔ آسان لفظوں میں قاری اس وقت تک تخلیق کے معنی سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ اس کیفیت سے سے دوران قرات نہ گزرے جس سے گزر کر مصنف نے تخلیق پیش کی ہے۔ حالاں کہ قاری کی حیثیت ثانوی ہے۔ جس کی نارسائی کا ذکر خود وزیر آغا نے بھی کیا ہے۔ کیا کوئی قاری چاہے وہ جس اعلیٰ ادبی ذوق کا حامل ہو، قرات کا تجربہ رکھتا ہو اور متن کے تمام مضمرات سے آگاہ ہو، دوران قرات اسی کیفیت، حالت یا صورت حال میں جا کر تخلیق کو سمجھ سکتا ہے جو تخلیقی عمل کے دوران مصنف پر طاری تھی، یا اس نے وہی تسکین پائی جو خلق کر لینے بعد تخلیق کار کو حاصل ہوئی۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ "تنقید اور جدید اردو تنقید" 1989ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وزیر آغا نے قاری کے بارے میں واضح اور بلیغ انداز میں قاری کی نارسائی کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ کریں، 'قاری اس پیمانے پر تخلیقیت کا مظاہرہ نہیں کرتا جو تخلیقی عمل کے میدان میں خود تخلیق کار بحیثیت قاری کرتا ہے پھر بھی بنیادی طور پر اس کی حیثیت ایک تخلیق کار کی ہی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تخلیق ایک معنی کی نہیں بلکہ لاتعداد معنی کی آماجگاہ ہے، قاری جب تخلیق کا مطالعہ کرتا ہے تو اپنی تخلیقی اپج کو بروئے کار لا کر تخلیق سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یوں کہ ایک بار پھر معنی آفرینی اور تخلیق کاری کے عمل کا آغاز ہو جاتا ہے'۔ بظاہر اس بیان میں تضاد ہے، کیسے؟

1۔ قاری تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا جس کا مظاہرہ تخلیق کار خود بحیثیت قاری انجام دیتا ہے۔

2۔ قاری اپنی تخلیقی اپج کے ساتھ معنی آفرینی کر کے تخلیق کاری کا دوبارہ آغاز کرتا ہے۔

پہلی بات میں وہ قاری کو ثانوی جبکہ دوسری بات میں اس کو تخلیقی عمل میں شریک کرتے دکھائی دیتے ہیں۔تاہم قاری کی نارسائی والا ان کا بیان زیادہ مضبوط ہے۔وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "قاری یا ناقد تخلیق اور اس کے اسرار سے روشناس ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے وہ اپنی قرات کے ذریعے معانی تخلیق کرتا ہے چوں کہ کائنات میں معانی کی تہوں کی کوئی حد نہیں ہے اور تخلیق بھی معنیاتی اعتبار سے بے کنار ہوتی ہے لہٰذا قاری یا ناقد تخلیق کی پُر اسراریت کا کبھی پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ویسے قاری یا نقاد کا منصب احاطہ کرنا ہے بھی نہیں۔"[۱۵]

"معنی اور تناظر" 1998ء میں ان کا مضمون 'لکھاری، لکھت اور قاری' شامل ہے۔اس انھوں نے مصنف، متن اور قاری کے مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ قاری کے ضمن ان کا کہنا ہے کہ، "ساختیات اور مابعد ساختیات کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے قاری کو تخلیق کار کا درجہ دے دیا اور یوں تخلیق کاری کے عمل میں ایک نئے بُعد کی نشان دہی کر دی۔ مگر اس میں گھپلا یہ ہوا کہ قاری کو مصنف سے ہم رشتہ کرنے کے بجائے اسے مصنف کی مسند پر بیٹھا دیا گیا اور مصنف کو مسند سے کہیں دور کر کے غائب کر دیا گیا۔ گویا پہلے مصنف مرکز تھا اب قاری 'مرکزہ' قرار پایا۔"[۱۶]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر آغا قاری کو مصنف کے برابر تسلیم کرتے ہیں، مصنف نہیں۔وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اصلا قاری بھی تخلیق کار ہے۔وہ مصنف اور قاری کو ایک عمل کے مدارج خیال کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی تین کتابوں، "تخلیقی عمل"، "تصورات عشق خرد اقبال کی نظر میں" اور "تنقید اور جدید اردو تنقید" میں انھوں نے قاری کو تخلیق کار کے برابر درجہ دیا ہے۔ "معنی اور تناظر" میں ہم دیکھتے ہیں ان کی رائے میں وہی ہے۔ان کا کہنا ہے تخلیق کاری کا سارا وظیفہ مصنف اور قاری کے مسلسل تفاعل کا عمل ہے۔ متن محض مصنف یا محض قاری کے تخلیقی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے Interaction ہی سے یہ معجزہ رونما ہوتا ہے۔بظاہر یہی محسوس ہوتا کہ وہ اپنی رائے میں قاری اساس تنقیدی نظریہ اس موڑ پر کھڑے ہیں جس کے مطابق تخلیق اس وقت بامعنی بنتی ہے جب وی قرات کی جائے۔اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ وہ تفہیم و تجزیہ کے حوالے سے قاری کی طرف ہیں بلکہ وہ مصنف کے حوالے سے بھی متن کو سمجھنے کے خواہاں ہیں۔یہ قاری اساس کے اس تصور پر کاری ضرب ہے جس نے معنی آفرینی کا سارا دارومدار قاری پر ڈال دیا۔وہ امید رکھتے ہیں کہ جس طرح مصنف اساس تنقید کہ جگہ متن کو سامنے لایا گیا اسی طرح ایک دن مصنف کو بھی واپس لایا جائے گا، جس کو قاری اساس تنقید نے مسترد کر دیا ہے۔

امتزاجی تنقید کی باقاعدہ نظریہ سازی ڈاکٹر وزیر آغا کی مرہونِ منت ہے۔'تخلیقی عمل' کی ماہیت، بنیادی تعقلات، وظائف، مبادیات اور شعریات کی وضاحت سے لے کر امتزاجی تنقید کی شعریات، اس کے اصول و ضوابط اور امتزاجی نقاد کے اوصاف تک کے مباحث اردو تنقید وزیر آغا کی عطا ہیں۔امتزاجی تنقید کے باب میں انھوں نے قاری/نقاد کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔تاہم یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ مصنف اور تخلیق کے بھی قائل ہیں۔امتزاجی تنقید میں قاری/نقاد کی کیا حیثیت و معنویت ہے، اس ضمن ان کے چند نکات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

1۔ امتزاجی تنقید کے مطابق تخلیق کاری کا عمل تخلیق کار اور قاری مل جل کر انجام دیتے ہیں۔

2۔ امتزاجی نقاد تخلیق کے سامنے کھلے دل و دماغ سے آکر، اس کی اہمیت اور وسعت سے آشنا ہوتا ہے۔اور یوں 'قاری' کا روپ دھار لیتا ہے۔

3۔ ہر اچھی تخلیق کا اپنا دستخط ہوتا ہے جسے نقاد یا قاری کی قرات ہی پہچان سکتی ہے۔

4۔ نقاد اگر نظریاتی عقیدے سے ماورا ہو کر کھلے دل و دماغ کے ساتھ تخلیق کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو تخلیق اپنے بند قبا (جسے آئزر نے خلا اور مائیکل ریفائٹری نے رکاوٹوں کا نام دیا) کو ڈھیلا چھوڑ دے گی۔

5۔ امتزاجی نقاد ان دائروں کو بے نقاب کرتا ہے جن میں معنی مقید ہوتے ہیں۔اس کا کام تخلیق کے جسمانی پیکر کے تجزیے سے شروع ہوتا ہے، جو تخلیق کو اس کے عہد کے تناظر میں دیکھتا ہوا، اسے تاریخی، سوانحی اور نظریاتی عوامل کی روشنی میں پرکھتا ہے۔

6۔ امتزاجی رویے کے حامل نقاد کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ قاری کے اجتماعی روپ یعنی زمانے کی آواز کو بروئے کار لاتا ہے۔

مذکورہ نکات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وزیر آغا نے اپنی امتزاجی نظریہ سازی میں قاری/نقاد کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ لیکن اس تھیوری میں مصنف، متن اور قاری میں کسی کو مرکزی حیثیت تفویض نہیں کی گئی ہے۔انھوں نے تنقیدی تھیوری میں سے کسی کو اہمیت نہیں دی ہاں مگر وہ قاری/نقاد کو اس تخلیقی عمل میں ضرور شریک کرتے ہیں یا دیکھنا چاہتے ہیں جو مصنف کے ہاں وجود میں آیا۔ان کے مطابق امتزاجی نقاد کو ہر قسم کے نظریاتی تعصب سے الگ ہو کر تخلیق کے ساتھ مکالمہ کرنا چاہیے۔اسے ہم تنقید کا تقاضا سمجھ لیں، تو یاد رکھنا چاہیے یہ تقاضا کم حکم زیادہ ہے، ان معنوں میں کوئی کوئی قاری/نقاد بغیر تعصب، ترجیح یا کسی آئیڈیالوجی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ قاری اساس تنقید میں تخلیق کے اعلیٰ ہونے نہ ہونے کا ذکر نہیں ہے لیکن امتزاجی تنقید کے مطابق تخلیق اور قاری دونوں نظریاتی وابستگی کے حامل نہ ہوں۔ ہر مصنف زندگی، سماج، کائنات اور ادب کا ایک تصور رکھتا ہے، اسے اس سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہر تخلیق میں شعوری نظریہ لایا جائے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تخلیق خالصتاً تخلیقی عمل سے گزر کر فنی ع فکری اور ادبی و جمالیاتی خصائص سے پر ہو۔

قاری کی اقسام اتنی ہی ہیں جتنے قاری ہیں۔تاہم معنی آفرینی کی صلاحیت، نظریاتی وابستگی اور قرات کے زیادہ یا کم تجربہ کی بنیاد پر قاری کی اقسام مختلف ناقدین نے بیان کی ہیں۔ وزیر آغا نے قاری کے سلسلے میں تین صورتوں کی نشان دہی کی ہے۔ پہلا قاری کنزیومر، دوسرا خود تخلیق کار اور تیسرا قاری زمانہ ہے جو عام قاری کا اجتماعی روپ ہے۔ تیسرے قاری کی وضاحت ضروری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ تخلیق خود اپنی اہمیت و حیثیت منوالیتی ہے یا کھو بیٹھتی ہے۔ دونوں صورتوں میں زمانہ ہی قاری ٹھہرتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ 'عام قاری' مصنف کی شخصیت سے متاثر ہو کر یا تخلیق میں اپنے عصر کے مسائل پا کر لطف اندوزی کے بعد جو فیصلے کرتا ہے وہ تعصبات پر مبنی ہوتے ہیں مگر قاری کا اجتماعی روپ 'زمانہ' تعصبات سے آزاد اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ بالکل اسی طرح انھوں نے نقاد کی بھی تین اقسام بیان کی ہیں۔اول وہ نقاد جو عام قاری ہے اور تعصبات و ترجیحات کی زد میں ہے۔ دوسرا نقاد خود تخلیق کار ہے۔اور تیسرا نقاد 'زمانہ' ہے۔ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ فاضل نقاد عام قاری کے تعصبات کو مان رہے ہیں، ہماری دانست میں خاص قاری ہو یا زمانہ وہ تعصبات سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ جس تخلیق کار یا تخلیق کو زمانہ قبول کر لے یا وہ مقبول ہو جائے اس کے پس منظر میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسے مقبول بنانے میں کن قوتوں کا عمل دخل ہے۔

وزیر آغا نے تخلیقی عمل میں قاری/نقاد کی شرکت کی بات کی ہے۔ان کے نزدیک متن فہمی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قاری/نقاد تخلیق کیر مز کو نہ پہچان پائے، یہ رمز اسی وقت فہم میں آسکتی ہے جب قاری دوران قرات خود کو اسی تخلیقی عمل میں لے جانے کی کوشش کرے گا جس سے گزر تخلیق اس کے سامنے آئی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> "جب فن کار کوئی شے تخلیق کرتا ہے تو تخلیق اظہار سے ابلاغ کی طرف سفر کرتی ہے مگر جب فن کار کے ہاں جسم حاصل کرنے کے بعد باہر کے قاری تک پہنچتی ہے تو قاری تخلیق کے جسم کو زینہ بنا کر واپس اس روح تک رسائی پانے کی کوشش کرتا ہے جسے شاعر کے ہاں اظہار کا نام ملا تھا گویا وہ فن کار ہی کی طرح ایک تخلیقی جست بھرتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس کی جست اظہار سے ابلاغ کے بجائے ابلاغ سے اظہار کی طرف ہوتی ہے یعنی ایک الٹا تخلیقی عملوجود میں آجاتا ہے۔"[۱۷]

مصنف:۔۔۔اظہار سے ابلاغ کی طرف سفر

قاری:۔۔۔ابلاغ سے اظہار کی طرف سفر

ابلاغیات کے طالب علم اس بات سے آگاہ ہیں کہ کامل ابلاغ اس وقت ہوتا ہے جب سوال جواب ہو جائیں۔اس بات کو آپ مثال سے سمجھیں۔فردِ واحد اور فردِ ثانی میں ابلاغ کیسے مکمل ہو گا۔اس کے دو مرحلے ہیں۔پہلے مرحلے میں فردِ واحد (تخلیق کار) نے تحریر یا تقریر کے ذریعے اپنا مدعا بیان کر دیا۔دوسرے مرحلے میں فردِ ثانی (قاری/نقاد) نے اس تحریری یا تقریری مواد کو سمجھ کر اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔جب تک فردِ ثانی اپنا ردِ عمل ظاہر نہیں کرتا اس وقت تک ابلاغ کامل نہیں ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک سائیکل ہے جس کی بنیاد پر وزیر آغا نے قاری/نقاد کو تخلیقی عمل میں شرکت دی ہے کہ وہ بھی اپنا اظہار اس وقت کرتا ہے جب وہ تخلیق کی تخلیقی رمز سے آشنا ہو جاتا ہے۔وہ جانتے ہیں تخلیقی عمل میں محض اظہار ہی کافی نہیں بلکہ ترسیل اور ابلاغ کی بھی اتنی ہی حیثیت ہے۔

قاری اساس تنقید کے باب میں ڈاکٹر وزیر آغا کی جملہ گزارشات جو تخلیق، قاری اور قرات کے گرد گھومتی ہیں سے مابعد جدید تنقید کے کئی اہم مباحث ہمارے سامنے آئے ہیں،ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ متن فہمی اور تنقید کے سلسلے میں مصنف، متن اور قاری میں سے کسی ایک سے انحراف نہیں کرتے بلکہ وہ ہر ایک کی ضرورت ،افادیت،اہمیت،ماہیت اور حیثیت سے واقفیت رکھتے ہیں ان کے قائل بھی ہیں۔ان سب کو مد نظر رکھ کر ہی انھوں نے 'امتزاجی تنقید' کی شعریات کو مرتب کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 2014ء) ص100

2۔ ایضاً، ص100

3۔ ایضاً، ص101

4۔ ایضاً، ص102

5۔ ایضاً، 102

6۔ ایضاً، ص103

7۔ ایضاً، ص103

8۔ ایضاً، ص104

9۔ ایضاً، ص104

10۔ ڈاکٹر سرور الہدیٰ۔ شمیم حنفی تنقید کا تخلیقی آہنگ (راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، 2019ء) ص114

11۔ قدوس جاوید۔ متن، معنی اور تھیوری (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2015ء) ص107

12۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 2014ء) ص95

13۔ ایضاً، ص84

14۔ ایضاً، ص84

15۔ ایضاً، ص103

16۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ معنی اور تناظر (لاہور: مجلس ترقی ادب، 2016ء) ص192۔193

17۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 2014ء) ص98